Volume 04, Issue 01,
January-March 2026
PP: 263-274
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

https://doi.org/10.63283/IRJ.04.01/17

Article QR

پشاور کے ابتدائی ادبی معرکے

The Early Literary Debates of Peshawar

Akhunzada Zahid Ali Askar[1], Dr. Saeeda Mukhtar[2]

Article History

Received
02-03-2026

Accepted
25-03-2026

Published
30-03-2026

Abstract & Indexing

Abstract

Literature serves as a mirror of the culture, society, and intellectual climate of every region, reflecting the values, traditions, emotions, and collective experiences of its people. Literary production is shaped by the social and cultural environment in which it emerges, and the spirit of competition has historically played a significant role in its development. While literary rivalry has often encouraged creativity, innovation, and the production of high-quality works, it has also given rise to envy, personal disputes, and intellectual conflicts. These literary contests have influenced not only the evolution of literature but also the relationships among writers and the broader literary environment. This study examines the early literary debates and rivalries of Peshawar, one of the oldest cultural centers of the Indian subcontinent. Renowned for its rich linguistic diversity, Peshawar has long been home to multiple civilizations and languages, providing fertile ground for literary and intellectual activity. Among the various languages spoken in the region, Urdu gradually emerged as a prominent literary medium and gained widespread recognition through the contributions of local and visiting scholars, poets, and writers. Using a historical and analytical approach, this article explores the formative literary encounters that shaped Peshawar's Urdu literary tradition. It highlights the participation of distinguished poets from different parts of the subcontinent, the organization of literary gatherings and national mushāʿirahs, and the intellectual exchanges that enriched the city's literary culture. The study concludes that these early literary contests significantly contributed to the growth of Urdu literature in Peshawar, establishing the city as an important center of literary excellence and preserving a vibrant tradition of scholarly dialogue and creative expression.

Keywords:

Peshawar, Urdu Literature, Literary Debates, Literary History, Mushāʿirah, Literary Culture, South Asian Literature, Intellectual History, Poetic Rivalry, Cultural Heritage.

[1] *Senior Scholar P.hd.* ****Corresponding Author***
[2] *Lecturer, Faizaia Inter College, Peshawar.*

All Rights Reserved © 2026 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

ادب کسی بھی ثقافت، معاشرے اور مزاج کی عکاسی کرتا ہے اور ایک ادیب چونکہ اسی معاشرے اور ثقافت کا حصہ ہوتا ہے، اسی لیے وہ معاشرے کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا تخلیق کردہ ادب انہی احساسات و جذبات کا عکاس ہوتا ہے، یعنی یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ایک ادیب معاشرے اور ثقافت کا نباض ہوتا اور ادب اس کے تخیل کے ذریعے معاشرے کی نمائندگی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جب بھی کسی انسان کی زندگی کا مکمل احاطہ کیا جائے تو وہ اس معاشرے اور سماج سے ہٹ کر نہیں کیا جاسکتا جس میں وہ زندگی بسر ہو رہی ہوتی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں ایک دوسرے پر برتری کا عنصر اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور کوئی بھی ذی روح برتری کے احساس سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ ادب چونکہ نقادِ زندگی ہے لہٰذا برتری کا یہ رجحان اہل ادب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ مسابقت کی اس فضا میں ادب پر مثبت اور منفی دونوں اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جہاں رقابت کا منفی عنصر ادب میں وارد ہوتا ہے وہیں مقابلے جیسا مثبت رجحان بھی پنپتا ہے، رقابت اور مقابلے کا یہی ملا جلا رجحان ادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دبستان پشاور کے شعراء و اُدبا میں بھی مذکورہ رجحانات کا عنصر پایا جاتا ہے۔ پشاور برصغیر کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے جو شہر ہفت زبان کہلایا جاتا ہے۔ یہاں مختلف تہذیبوں نے آنکھ کھولی، کئی زبانیں پھلی پھولیں اور ادب نے یہاں فروغ پایا، یہ گندھارا جیسی قدیم ترین تہذیب کا بھی مسکن رہا۔ دوسری زبانوں کی نسبت اُردو وہ زبان ہے جس کو یہاں ابتدائی دور ہی میں پذیرائی حاصل ہوئی اور اس زبان کے ادبی معجزات سے یہاں کے ادبی ماحول کی بلندی اور تخیل کی مثالیں آج بھی ادبی فضا کو معطر کیے ہوئے ہیں، کیونکہ سرزمین پشاور تہذیبوں اور زبان کے لیے ابتدائی درس گاہ کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس مقالے میں اُردو ادب کے ابتدائی چند ادبی معرکوں کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ادیبوں کی ادبی چشمکوں کو منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ہے جس میں پشاور میں بسنے والے برصغیر کے شعراء کی دلچسپی، قومی میلوں اور ان میں پیش آنے والے واقعات کو ملاحظہ کیا جائے گا۔

کلیدی الفاظ: چشمک۔ معرکہ۔ معاصرانہ رقابت۔ رستگاری۔ یورش۔ بُھس پُھسی

خوب سے خوب تر کی تلاش انسان کا فطری عمل ہے جو انسان کے آگے بڑھنے کی جستجو اور زندگی کی دلیل ہے، لیکن جب دلیل پر حسد کا جذبہ غالب آجائے اور مدمقابل کو صلاحیت کے بجائے رشک یا حسد کے جذبے کے تحت مات دینے کی ٹھان لی جائے تو پھر یہی فطری عمل رقابت کو جنم دیتا ہے، اگرچہ مدمقابل سے رقابت صلاحیتوں میں نکھار کا باعث بھی بنتا ہے مگر اس کے نتیجے میں عناد کو زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایک ہی پیشہ سے منسلک دو افراد کی رقابت دراصل اس پیشہ میں سبقت لے جانے کی کوششوں کو فروغ دیتا ہے مگر ساتھ ساتھ اپنے حریف کو مات دینے کے لیے ہر طرح کا داؤ پیچ آزما کر پیشہ وارنہ سرگرمیوں میں منفی سوچ کی ترویج کا بھی باعث بنتا ہے، اس سوچ کے حامل طرز عمل کو پیشہ وارانہ رقابت کہا جاتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب کے میدان میں بھی پیشہ ورانہ رقابت ہمیشہ کارفرما رہی ہے، اسی پیشہ ورانہ رقابت کی بدولت جہاں طرفین کو اپنے کام کے ساتھ ساتھ مدمقابل کے کام کے انتقادی جائزے کا فن ہاتھ آیا، وہیں اپنے ہنر میں پختگی کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اسی لیے اس پیشہ ورانہ و معاصرانہ رقابت کے ادب پر مثبت اثرات رونما ہوتے رہے ہیں اور جب کوئی اِسی رقابت کے زیر اثر مدمقابل کے کام یا فن پر کھلی تنقید کا اظہار کرتا ہے یا بالفاظ دیگر کھلی مخالفت کرتا ہے تو یہاں سے ہم عصروں کے درمیان مقابلے کا ایسا میدان گرم ہوتا ہے جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ رقابت رشک کے حوالے سے ہو تو خیر لیکن جب رقابت میں حسد کے جذبات کارفرما ہو جائیں تو معاملہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب کے میدان میں بھی ہم عصروں کے درمیان یہی پیشہ ورانہ رقابت نے معمولی نوک جھونک، غیر معمولی چوٹوں اور چشمکوں سے بڑھ کر مجادلوں، مناقشوں اور معرکوں کی شکل اختیار کی۔ ادبی چشمک و ادبی معرکہ ہے کیا؟ بقول ڈاکٹر محمد یعقوب عامرؔ:

''ایک ہی فن کے دو ماہرین میں نوک جھونک اور معاصرانہ چشمک ہونا عام بات ہے جبکہ ادبی معرکے کی بنیاد اسی معاصرانہ کشمکش پر قائم ہوتی ہے اور یہ کشمکش ان تمام چیزوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ جو ذاتی غم و غصہ اور عصری عصبیت کے باعث وجود میں آتی ہیں''[1]

اِن معاصرانہ چشمکوں اور معرکوں کی ابتداء میں تذکرہ نگاری، مشاعرے، ادبی رسائل و جرائد جیسے عوامل کی کار فرمائی بخوبی نظر آتی ہے۔ ان ادبی چشمکوں کے ابتدائی آثار ہمیں تذکرہ نگاری میں ملتے ہیں جہاں تذکرہ نویسوں نے شعراء و اُدبا کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کے فن پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور یہ رائے تعریفی کلمات کے علاوہ تنقید اور بعض اوقات کڑی تنقید سے لبریز ہوتی جیسا کہ مصحفیؔ نے اپنے تذکروں ''تذکرہ ہندی گویاں'' اور ''ریاض الفصحا'' میں اپنے حریف انشاء اللہ خان انشاؔ پر کئی جگہوں پر چوٹیں کی ہیں۔ تنقید کرنے والا خود بھی ہم عصر یا ہم پیشہ ہی ہوتا ہے نتیجہ جس پر تنقید کی جاتی ہے وہ یا اُس کے حامی بُرا مان کر جوابی کاروائی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور بدلے میں خطوط یا پھر تذکرہ نگاری ہی کے ذریعے اس کا جواب بہم پہنچاتے ہیں۔ علاوہ ازیں تذکرہ نگاروں نے اپنے دیباچوں اور مقدموں میں بھی مختلف علاقوں اور شہروں کے شعراء پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کا مقدمہ شعر و شاعری اس کی بڑی مثال ہے کہ جس کے رد عمل میں مقدمہ ہی کے عنوان سے ایک بہت بڑا محاذ کھل گیا جو سالوں جاری رہا، جس کے تحت اخبارات ور سائل میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا۔ یہ تو حالیؔ کی تحمل مزاجی کام آئی اور یوں یہ معرکہ یک طرفہ معرکہ ثابت ہوا۔ کچھ اسی قسم کا حال مشاعروں کا بھی تھا بلکہ یہاں تو بات اس سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں آمنے سامنے برجستہ مکالموں اور فی البدیہہ اشعار کا تبادلہ ہوتا اس لیے یہاں بڑے بڑے شعراء کی گروہ بندیاں نمایاں نظر آتی ہیں یوں اس دور کے مشاعروں میں شعراء اور ان کے حامی ''کیل کانٹے'' سے لیس ہو کر آتے تھے اور اس ''کیل کانٹے'' سے مُراد ان کا تازہ اور معرکہ آرا کلام بھی ہوتا اور ہتھیار بھی۔ ہر ادبی معرکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے بقول محمد یعقوب عامرؔ:

''بعض معرکے خفیف اور معمولی چشمکوں سے آگے نہیں بڑھے مگر بعض معرکوں میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ ان سے پوری ادبی فضا متاثر ہو جاتی ہے، پھر ان معرکوں کا معاملہ خفیف و شدید مخالفت تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ایک فریق خاموش نظر آتا ہے اور دوسرا برسرِ پیکار، کہیں ایک گروہ علی الاعلان چیلنج کرتا ہے اور دوسرا خاموش ساز شیں۔''[2]

جب ادبی اداروں اور ادبی تحریکوں نے جنم لیا تو یہی ادبی مجادلے اور معرکے ان اداروں کی گود میں پروان چڑھتے نظر آتے ہیں، کیونکہ ہر ادبی ادارہ اپنے سے پہلے ادارے کے رد عمل کی پیداوار ہوتا ہے اور اُسی سوچ کے حامی اُس کا حصہ اور اپنے مخالفین کے مقابل محاذ کھولے نظر آتے ہیں۔ رسائل و جرائد میں بھی ادبی نظریات سے متعلق مخالفت اور موافقت، ابتداء میں نظریات کے ٹکراؤ کا باعث ہوتا جبکہ تمام عوامل میں بات بڑھتے بڑھتے ذاتیات پر اُتر آتی، ان ادبی معرکوں کی وجوہات میں مشاعروں میں ایک دوسرے کے حریفوں کو دعوت دے کر آمنے سامنے لا بٹھا کر مشاعرہ کامیاب بنانے، اُمراء و رؤسا کی خوشنودی کا حصول، ان کے درباروں میں مقام یا انعام و اکرام کا لالچ یا پھر بقول امیر حسین نورانی ایک دوسرے پر سبقت لے جانا بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال اسباب و علل میں شعر کا توارد وجہ بنے یا مضامین کا لڑ جانا یا پھر قافیہ ردیف کا سرقہ یہ تو طے ہے کہ سلسلہ جنبانی جب ایک مرتبہ چل پڑتا تو پھر رُکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

دنیا کی ہر زبان کے ادب میں معاصرانہ چشمکوں کا حال ضرور ملے گا۔ عربی زبان و ادب میں فرزدقؔ اور جریرؔ جیسے شاعروں کے مناظرے، فارسی زبان و ادب میں رشیدؔ و طواط۔ ؔ، گنجویؔ، خاقانیؔ، انوریؔ، سعدیؔ، زلاکانیؔ اور حکیم شفائیؔ کے ادبی معرکے وغیرہ۔ برصغیر پاک و ہند میں ادبی معرکوں کے دو بڑے مراکز دہلی و لکھنؤ تھے جبکہ دکن میں معمولی نوک جھونک ہی کی نوبت آئی۔ سکندرؔ و میر ضاحکؔ، میرؔ و جراتؔ، انشاؔ و جراتؔ، میرؔ و بقاؔ، مہلتؔ و محشریؔ، میرؔ و سوداؔ، انشاؔ و مصحفیؔ، آتشؔ و ناسخؔ، انیسؔ و دبیرؔ، غالبؔ و ذوقؔ اور داغؔ و امیرؔ کے ادبی معرکے وہ ادبی معرکے ہیں

جن میں شعر و ادب پروان چڑھتا بھی دکھائی دیتا ہے اور بعض ادب سے کوسوں دور بھی دکھائی دیتا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ منہ سے نکلی بات اور قلم سے لکھا لفظ واپس نہیں لیا جا سکتا خصوصاً کہ جب وہ زبانِ خلق تک پہنچ کر نقارہ خدا بن جائے۔ اب غالبؔ بھلا ذوقؔ پر اُچھالا یہ مصرعہ کس طرح اُردو ادب سے کھرچ سکتے ہیں کہ: "ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا"

صوبہ خیبر پختونخوا کے دارالخلافہ شہر پشاور میں بھی بڑے بڑے ادبی رن پڑے، بعض جگہ تو کندھے تول تول کر ہی رہ گئے مگر بعض واقعات میں کندھے ٹکرائے بھی۔ دبستانِ پشاور کی معاصرانہ چشمکیں دراصل ادبی اداروں کی معاصرانہ چشمکیں تھیں جن میں کسی حد تک ذاتیات بھی شامل ہو جاتیں۔ اِن ادبی معرکوں میں بات اشارے کنایوں سے نکل کر ہجو ملیح اور اس سے بڑھ کر ہجو قبیح کی حد کو چھوتی نظر آتی ہے۔ پشاور میں معاصرانہ چشمکیں چونکہ ادبی اداروں کی دین ہیں، لہٰذا انہی اداروں کے زیر اثر ہونے والے مشاعرے اِن مجادلوں اور مناقشوں سے لبریز نظر آتے ہیں، اس لیے فارغ بخاری کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے کہ درحقیقت یہاں کے پورے ادب کی تاریخ انہیں ادبی اداروں کے گرد گھومتی ہے۔ اگرچہ ان ادبی اداروں کے وجود سے قبل پشاور کے مشہور و معروف شاعر سید جگر کاظمی نے 1897ء میں ہونے والے ایک مشاعرے کا ذکر اپنے مضمون میں کیا اور مزید تین یا چار مشاعرے اور بھی منعقد ہوئے جن کا ذکر تو فارغ بخاری کی ادبیات سرحد اور خاطر غزنوی کے "ایک کمرہ" میں بھی سنین کے اختلاف کے ساتھ ملتا ہے، لیکن ان میں کسی معاصرانہ نوک جھونک کا ثبوت نہیں ملتا اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ ادبی اداروں کے قیام کے بعد ان معاصرانہ چشمکوں کا آغاز ہوا۔ بزمِ سُخن اور لطفِ سُخن یا بزمِ افکار، بزمِ سُخن اور دائرہ ادبیہ، ادبستان اور دائرہ ادبیہ، انجمن ترقی اُردو اور اُردو سبھا اِن تمام اداروں نے پشاور اور پشاور سے باہر صوبہ بھر میں شعر و ادب کے ماحول کو گرمائے رکھا۔ پشاور میں سب سے پہلے 1890ء میں چند دوست شعراء پشاور کے علاقے کوچہ رسالدار اندورن قصہ خوانی میں مرزا غلام حسین مسگرؔ کی دکان میں جمع ہو کر بیٹھے۔ تانبے کے برتن بنانے والے اس ادب دوست مسگرؔ کے دوستوں میں مشہور شاعر احمد علی سائیںؔ، مسجدی شاہ خادمؔ، خان محمد عاصیؔ اور جگرؔ شاہ کاظمی شامل تھے۔ پھر اِن میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بقول فارغ بخاری:

> "سائیں احمد علی کو خیال ہوا کہ ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرو کر ایک مرکز میں جمع کیا جائے اور اِسی خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اُنہوں نے 1903ء میں پشاور میں "بزمِ سُخن" کی بنیاد رکھی۔"[3]

بزمِ سُخن کے ابتدائی اراکین میں مذکورہ اراکین کے علاوہ قمر علی قمرؔ سرحدی، سید لال شاہ برقؔ، مرزا غلام عباس، خالص مکی، قاضی محمد عمر قضاؔ روحی، میر عباس نمایاں تھے۔ سید جگر کاظمی کی ایک طویل غزل جو اُنہوں نے بزمِ سُخن کے بارے میں لکھی جس میں اُنہوں نے اکتیس شعراء کرام کے نام گنوائے جو اس بزم سے وابستہ تھے۔

1905ء کے لگ بھگ کوچہ رسالدار ہی میں جعفر علی جعفری نے پنساری کی دُکان کھولی اور شعرائے پشاور کو مل بیٹھنے کا ایک اور ٹھکانہ ہاتھ آ گیا۔ 1920ء تک اس انجمن کے تحت شعر و ادب کی محفلیں سجتی رہیں اِسی دوران میر عباس کا قہوہ خانہ بھی علمی ادبی سرگرمیوں کے لیے مشہور رہا، 1920ء بزمِ سُخن کی ادبی اجارہ داری کو بزمِ سُخن ہی کے اہم رکن قمر سرحدی قمرؔ سرحدی نے یوں ختم کیا کہ چند ایک اراکین سے اصولی اختلاف کے باعث قمر سرحدی نے بزمِ سخن سے الگ ہو کر چند ہی قدم کے فاصلے پر مسلم ریسٹورنٹ کے نام سے ایک ہوٹل کھول لیا اور "لطفِ سُخن" کے نام سے ایک ادبی ادارے کی بنیاد رکھ دی، یوں لطفِ سُخن پشاور کی تاریخ کا دوسرا باقاعدہ ادبی ادارہ تھا۔ قمرؔ سرحدی ادبی لحاظ سے اک شعلہ بیاں اور نہایت متحرک شخصیت کے مالک تھے جو عام ڈگر پر چلنے کے بالکل بھی عادی نہ تھے۔ مشکل پسند تھے اس لیے لگی بندھی روش پسند نہ کرتے تھے اِن کے بارے میں خاطر غزنوی اپنے مضمون میں شوکت واسطی کے حوالے سے اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"شوکت واسطی باشعور اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اس کے تعلق کا سلسلہ وسیع تر تھا چنانچہ سرحد میں قمرؔ سرحدی کے بعد کل ہند اور کل پاکستان مشاعروں کے انعقاد کا سہرا اسی کے سر رہا۔"[4]

خالص ملیؔ اور برقؔ کوہاٹی کے علاوہ لطف سُخن میں غیر مقامی شعراء میں امیر مینائی کے بھانجے مولانا امیر احمد اور عیش فیروز پوری قابلِ ذکر تھے۔ سرائے ہری جگن لطفِ سُخن کے مشاعروں کا مستقل مرکز بنے رہا جبکہ بزمِ سُخن بھی نئے جوان شعراء کے ہمراہ صف آرا ہوئی اور اکھاڑا کوچہ ناظر طاہر وردی میں مشاعروں کو جمایا۔ برقؔ کوہاٹی، میر عباس سے دوستانے کے باعث بزمِ سُخن سے وابستہ ہو گئے۔ دونوں انجمنوں کی چشمک بڑھ کر رقابت کی صورت اختیار کر گئی تھی اور بات ذاتیات تک پہنچ گئی، دراصل بزم سُخن اپنی سترہ سالہ ادبی حاکمیت کو اتنی آسانی سے چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی لہٰذا بزمِ سُخن نے لطفِ سُخن کو آڑے ہاتھوں لیا، تو اِدھر قمرؔ سرحدی اور خالص ملی جیسے نڈر اور کچھ کر گزرنے والے جوان شعراء نے بھی کوئی پرواہ کیے بغیر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ٹھان لی۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں مشاعرے ہونے لگے اور یہاں تک کہ ایک تاریخ اور ایک ہی وقت میں دونوں انجمنوں کے مشاعرے منعقد ہونے کا اعلان ہو جاتا۔ مشاعرہ سننے کے لیے اور اپنے اپنے مشاعرے میں ہجوم بھیڑ زیادہ کرنے کے لیے لاریاں بھر بھر کر لوگوں کو لایا جاتا اور دونوں اطراف سے ایک دوسرے کے مشاعرے کو ناکام بنانے کی سازشیں کی جاتیں۔ اس ضمن میں فارغؔ بخاری فرماتے ہیں:

"قمرؔ سرحدی اِن منصوبوں میں ماہر سمجھے جاتے تھے کبھی منادی کرا دیتے کہ بزمِ سُخن کا مشاعرہ ملتوی ہو گیا ہے کبھی لاریاں لے کر سارے شہر میں گھومتے اور لوگوں کو غلط فہمی دِلا کر بزمِ سُخن کے بجائے لطفِ سُخن کے مشاعرے میں لے جاتے۔"[5]

دراصل یہ سلسلہ یوں شروع ہوا کہ عیش فیروز پوری نے غزل پڑھی جس پر رفعت بخاری نے اعتراض کیا، بات بڑھ گئی اور خالص ملی نے رفعت کو چیلنج کر دیا کہ اس انداز کی غزل لکھ کر دکھائے۔ جانبین میں طرح مصرعہ طے ہوا کہ "قطرے ٹپک ٹپک کر موتی بنے لگن میں" چنانچہ دوسرے ہی روز اپنی اپنی غزلیں لے کر سب پہنچ گئے۔ ان غزلوں میں ایک دوسرے پر کھلی چوٹیں کی گئیں۔ مثلاً خالص ملی نے کہا:

ہر لحظہ چلتے چلتے اوصاف گلبدن میں
اب لال ہو گئی ہے میری زباں دہن میں
کم ظرفی زمانہ حد سے گزر چلی ہے
لونڈے بھی اب تعلّی کرنے لگے سُخن میں

عیش فیروز پوری گویا ہوئے:

اس شان و بانکپن سے آئے ہم انجمن میں
اک آگ لگ گئی ہے غیروں کے تن بدن میں
پہلے جواب کوئی لائے تو اِس سُخن کا
کیا عیش طعنہ دے گا ہم کو کوئی سُخن میں

رفعت بخاری نے جواب دیا:

محوِ خرام جس دم ہوتے ہیں ہم چمن میں
سب دیکھتے ہیں ہم کو یوسف کے پیرہن میں
ذوقِ سلیم سیکھے کوئی تو ہم سے سیکھے

رفعت ہے شاعری میں اور اوج ہے سُخن میں

بات بڑھ گئی اور دونوں حریفوں میں کانٹے کا مقابلہ چل نکلا اور معاملہ اس قدر بڑھا کہ قمرؔ سرحدی نے بزمِ سُخن کے مرکز سے چند قدم کے فاصلے پر مسلم ریسٹورنٹ کے نام سے ایک ہوٹل کھول دیا (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) جو لطفِ سُخن کے شعراء کا مرکز بن گیا۔ جہاں نئے اور پرانے شعراء کا جمگھٹا لگا رہتا۔ جب بھی کوئی مشاعرہ ہوتا اسی ہوٹل میں شعراء کی جمع واری ہوتی اور قمرؔ سرحدی، خالص مکی اور دیگر احباب کا گروہ یوں مشاعرے کے لیے روانہ ہوتا۔ جیسے کوئی پہلوان اکھاڑے میں اترتا ہے لوگ انہیں دیکھ کر ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتے اور یوں مشاعرہ گاہ کی طرف لوگوں کا ایک ہجوم بڑھنے لگتا کہ آج کانٹے کا مقابلہ ہونے جارہا ہے۔ لیکن بقول فارغؔ بخاری روز روز کی نوک جھونک رنگ لائی۔ معاملہ بڑھا اور ایک دن نہایت خون ریز معرکہ ہوتے ہوتے رہ گیا دونوں طرف سے کلہاڑیاں، ڈنڈے اور چاقو نکل آئے، ایک آدھ شاعر زخمی بھی ہوا لیکن بروقت پولیس کی مداخلت سے خیر ہوئی اور کچھ عرصے کے لیے دونوں گروہوں کے مشاعرے بند کر دیئے گئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پھر وہی مشاعرے اور وہی معاصرانہ جنگیں۔ 1925ء میں لطفِ سُخن کا نام بدل کر "بزمِ ادب" رکھ دیا گیا۔ لیکن بزمِ سُخن اور بزمِ ادب کے درمیان یونہی ٹھنی رہی۔

شہر پشاور کی اس ہنگامہ خیز ادبی رونقوں سے ذرا پرے پشاور چھاؤنی میں 1936ء میں پشاور سے باہر سے آئے ہوئے شعراء پر مشتمل ایک انجمن "بزمِ افکار" کے نام سے وجود میں آئی۔ ان میں رساؔ بریلوی، عزیز صہبائیؔ، عباس اثرؔ، جبکہ مقامی شعراء میں ناطق درانی اور ذوالفقار علی بخاری جیسے شعراء تھے۔ بزمِ افکار نے معرکہ آرائیوں میں الجھے شعراء کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے پہلی مرتبہ پنجاب کے مشہور شعراء کرام کو اپنے مشاعرے میں دعوت دی۔ ابتداء میں تو بزمِ سُخن اور بزمِ افکار کی بنی رہی لیکن لطفِ سُخن (بزمِ ادب) کی چوٹ کھائی بزمِ سُخن کو بزمِ افکار کی سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ بزمِ افکار کے مشاعروں میں مشہورِ زمانہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کی آمد، اُن کا ترنم میں کلام پڑھنا بزمِ افکار کے مشاعروں کو کامیاب بنا رہا تھا، جبکہ بزمِ سُخن موقع کی تلاش میں تھی اور پھر موقع اُن کے ہاتھ آ گیا دراصل حفیظ نے تعلّی کا شعر کہہ دیا اُنہوں نے حفیظ جالندھری کے ترنم کا سحر توڑنے کے لیے چند مترنم شعراء میر عباس میرؔ اور امانت علی امانت کو تیار کر کے مشاعرے میں بھیجا۔ بزمِ سُخن کے شعراء نے مشاعرے میں حفیظ پر یہ کہہ کر شدید چوٹیں کی کہ:

زبان پوچ شباہت قبیح فکر غلیظ
یہی ہے شاعر پنجاب، کیا یہی ہے حفیظ

یہ سن کر مشاعرے میں بے چینی پھیل گئی۔ بزمِ افکار کے منتظمین حرکت میں آ گئے مگر اب کیا ہو سکتا تھا، اب تو وہ بزمِ سُخن پر اعتبار کر بیٹھے تھے ابھی اس کا حل سوچ رہے تھے کہ بزمِ سُخن نے مہمان شعر پر ایک اور چوٹ کر دی:

شعر پڑھنے کے لیے اب زیر و بم درکار ہے
شاعر و قوال کی پہچان اب دشوار ہے

پھر تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تمام شاعر اُٹھ کھڑے ہوئے، بزمِ افکار مہمان کی بے عزتی پر چراغ پا ہو گئے اور بات لڑائی اور گالی گلوچ تک آ گئی، مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔ بزمِ سُخن کا مقصد پورا ہو گیا اور وہ لڑائی کے بعد مشاعرہ سے اُٹھ کر چلے گئے۔ بزمِ سُخن جو کہ ایک عرصے سے لطفِ سُخن (بزم ادب) سے برسرِ پیکار رہی تھی۔ بزم افکار سے نپٹنا کوئی مشکل کام نہ تھا کیونکہ مقابلے کے تمام گروں سے واقف تھی تاہم ایک ہی وقت میں دونوں انجمنوں سے مقابلے کا حوصلہ نہ پا کر بزمِ ادب سے سمجھوتہ کر لیا اور یوں دونوں نے بزمِ افکار کے لیے میدان مشکل بنانے کے لیے پشاور چھاؤنی میں اپنی اپنی شاخیں کھول کر دھڑلے سے مشاعروں کے پنڈال سجانے شروع کر دیئے۔ اب بزمِ سُخن اور بزمِ ادب دونوں نے

مل کر انجمن ترقی اُردو کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے روحِ رواں بھی قمر علی قمرؔ سرحدی تھے جنہوں نے خالص ملکی، نذیر مرزا برلاس اور میر عباس میرؔ، جیسے شعراء کے ساتھ مل کر بزمِ افکار کو مشاعروں میں آڑے ہاتھوں لیا اور ایسے جارحانہ انداز سے مشاعرے منعقد کرائے کہ نو آموز بزمِ افکار کے قدم اُکھڑ گئے اور یوں بزمِ افکار کی خاموشی نے پشاور چھاؤنی کے ادبی ہنگاموں کو اختتام دیا۔

قمرؔ سرحدی کی کوششوں نے انجمن ترقی اُردو کو خوب ترقی دی۔ بقول فارغ بخاری:

"قمرؔ سرحدی نے انجمن ترقی اُردو پشاور کا الحاق اورنگ آباد کی مرکزی انجمن سے کر دیا اور اُنہیں چندہ بھی بھیجا اور بہت سارا لٹریچر منگوا کر ایک لائبریری قائم کر دی، اس وقت بزم سُخن کی باگ دوڑ سائیں احمد علی کے ہاتھ تھی، آپ بزمِ سُخن کے سرپرست تھے اور میر عباس میرؔ سیکرٹری، اِدھر بزمِ ادب اور انجمن ترقی اُردو دونوں انجمنوں کے جنرل سیکرٹری قمرؔ سرحدی تھے۔"[6]

بزمِ سُخن اور بزمِ ادب کے اختلافات ختم ہوئے، تو بزم سُخن میں سکوت طاری ہونے لگا یہ کیفیت اور یہ طرحی مشاعرے اب بزم سُخن کے جوان خون کو قبول نہ تھے اور بوڑھے خون میں اتنی سکت نہ تھی، لہٰذا 1935ء میں اِسی بزم سے الگ ہو کر نوجوان شعراء نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام دائرہ ادبیہ رکھا گیا، اس ادارے کے بانی عبدالودود قمر، ضیاء جعفری، نذیر مرزا برلاس، مظہر گیلانی اور امیر انورؔ تھے۔ اس انجمن کا مقصد بدلتے وقت کے ادبی تقاضوں کو بروئے کار لا کر نئی اصناف سُخن پر طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ قدیم اصناف میں جدتِ مضامین لانا تھا۔ اس انجمن کو جدت پسندوں نے رجحان و فکر کا ارتقاء اور تنوع کی روشنی بخشی، مگر حسبِ دستور سابق لطفِ سُخن (بزمِ ادب) اور بزمِ افکار سے دو دو ہاتھ کرنے والی بزمِ سُخن کو دائرہ ادبیہ کی یہ اُٹھان ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ دراصل ادبی اجارہ داری کی مدعی تھی اور ہر نئی جماعت کو اپنی اجارہ داری کی موت کا سبب جان کر سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے میدانِ مخالفت میں کود پڑتی، سو اب کی دفعہ بھی یہی ہوا بس موقع کی تلاش میں تھی۔ 1935ء ہی کی بات ہے ہندوستان میں سب سے پہلا ریڈیائی مشاعرہ پشاور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا اور اُس وقت کے طریقۂ کار کے مطابق دائرہ ادبیہ کو یہ اعزاز ملا کہ وہ جماعتی طور پر مشاعرہ پڑھیں۔ مشاعرہ میں اُنہوں نے اپنے اپنے کلام میں "بزمِ سُخن" کے اراکین پر شدید چوٹیں کیں۔ فارغؔ بخاری تو ادبیات سرحد میں یہ کہتے ہیں کہ دائرہ ادبیہ اور بزمِ سُخن کے معرکوں کی ابتداء پشاور ریڈیو اسٹیشن سے ہوئی، جبکہ پہلے مشاعرے میں دائرہ ادبیہ کا بزمِ سُخن کے اراکین پر اعلانیہ شدید چوٹیں کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس سے پہلے بھی دونوں انجمنیں آپس میں دو دو ہاتھ کر چکی ہیں جس کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ بظاہر ادب و احترام سے دائرہ کے ارکان کا بزمِ سُخن سے جُدا ہونے کے بعد پہلی ہی مرتبہ اتنی شدید چوٹوں کا جواز نہیں بنتا۔ بہر حال سب سے پہلا قطعہ ضیاءؔ جعفری نے برقؔ کوہاٹی کے خلاف پڑھا کہ:

رستگاری کی اس میں بات کہاں
یورشِ ابر سے نجات کہاں
مہر و مہ سے اسے نہ دو نسبت
شعلۂ برق کو ثبات کہاں

اور پھر ایک ایک کر کے سبھی دائرہ ادبیہ کے ارکان نے گویا بزمِ سُخن پر بوچھاڑ کر دی۔ بزمِ سُخن نے ریڈیو والوں سے شکایت کی، بقول فارغؔ بخاری انہیں پتہ ہی نہ چلا اب اگلا مشاعرہ بزمِ سُخن کا تھا۔ بدمزگی سے بچنے کے لیے ریڈیو والوں نے بزمِ سُخن والوں سے مشاعرے میں پڑھا جانے والا کلام منگوایا لیکن بزمِ سُخن بھی نہایت تجربہ کار تھی اُنہوں نے وہ کلام بھیج دیا جو ان چوٹوں کے جوابات سے پاک تھا اور جب مشاعرہ پڑھنے

لگے تو ہر شاعر نے اپنی غزل اور نظم سے پہلے دو دو چار چار سُخن گسترانہ رباعیاں پڑھیں جو شدید جوابی کاروائی سے لبریز تھیں۔ برقؔ کوہاٹی نے ضیاءؔ جعفری کا جواب یوں دیا کہ:

نہ پوچھ رتبۂ اوج کمال اہل کمال
فلک پہ برقؔ درخشاں ضیاء زمین پر ہے

جب ریڈیو والوں کو اس کا علم ہوا تو پانی سے سر گزر چکا تھا، نتیجتاً ریڈیو سے مشاعرے ہی بند کر دیئے گئے۔ ریڈیو پر مشاعرے تو بند ہو گئے مگر دونوں ادبی اداروں کے درمیان معرکہ آرائی بڑھتی ہی چلی گئی۔ دوسرا بڑا ادوبدو معرکہ دائرہ ادبیہ اور بزمِ سُخن کے درمیان بزمِ اُردو ایڈورڈ کالج پشاور کے اسٹیج پر ہوا۔ اساتذہ میں سے خالص ملکؔ اور جگرؔ کاظمی نے دائرہ ادبیہ کا اور جعفریؔ، میر عباس میرؔ، رضاؔ ہمدانی، کیفیؔ سرحدی اور ناصر علی ناصرؔ نے بزمِ سُخن کا ساتھ دیا۔ دونوں ادبی اداروں کے شعراء آمنے سامنے آئے۔ بقول فارغؔ بخاری بزمِ سُخن کے جعفریؔ نے پہلے اُٹھ کر بھرپور وار کیا:

ہے جعفری آج ان کو بھی دعوائے سُخن
کل سیکھنے آتے تھے جو ابجد ہم سے

ضیاء جعفری نے جواب میں کہا:

ضیاؔ امامِ سُخن ہوں میں آج سرحد میں
یہ میر و ناصر علی، برق و جعفری کیا ہیں

بزمِ سُخن میں سے کسی نے براہ راست خالص ملک پر چوٹ کی جو نجار پیشہ تھے۔

اشعار سناتے ہوئے شرم آتی ہے
کہلانے لگے جب سے کہ شاعر نجار

اس کے جواب میں دائرہ ادبیہ کے شاعر نے کڑک کر یوں دعوت مبارزت دی:

جس کو دعویٰ سُخن ہو وہ مقابل آئے

بزمِ سُخن والے بھلا کیوں پیچھے رہتے، ایک شاعر نے اس دعوت کے جواب میں جعفری کا یہ شعر پڑھا:

یہ مظہر و برلاس و ضیا جعفری کیا ہیں
آئیں جو مقابل میں تو خالص جگر آئیں [7]

خیر یہاں تو زبانی کلامی میدان جنگ کا منظر رہا، لیکن بُرا تب ہوا جب دائر ادبیہ کے بعض جذباتی اراکین نے بزمِ سُخن کے ایک اہم رکن اور مشہور شاعر کیفیؔ سرحدی کو قصہ خوانی بازار میں پیٹ ڈالا، جس کا ذکر پنجاب کے اخباروں خصوصاً انقلاب اور زمیندار کے فکاہی کالموں میں ہوتا رہا۔

اِن دونوں اداروں کی آویزشوں سے تنگ آ کر 1938ء میں فارغؔ بخاری، رضاؔ ہمدانی، مظہر گیلانی، شمیمؔ بھیروی، مضمر تاتاری اور عشرت ملک نے ایک اور ادبی ادارے ادبستان کی بنیاد رکھی۔ یہ دراصل ترقی پسند شعراء و ادبا پر مبنی مکتبہ فکر کے حامل لوگوں کا گروہ تھا۔ یہ زمانہ اور خصوصاً یہ صوبہ سیاسی تحریکات کے شباب پر تھا۔ انقلاب کے نعرے نظم و نثر کے قالب میں ڈھل رہے تھے۔ لیکن ادبستان کے ساتھ بھی وہ ہوا جو ان سے پہلے ادبی اداروں کے ساتھ ہوا تھا، یعنی بزمِ سُخن اور دائرہ ادبیہ دونوں نے اس نو تعمیر ادبی ادارے کے خلاف محاذ کھول لیا۔ فارغ

بخاری نے ادبیات سرحد میں یہ تو کہا کہ دونوں اداروں نے محاذ قائم کیا مگر وجہ نہیں بتائی صرف یہ کہا کہ بزمِ سُخن کی ازلی اجارہ داری کا جنون۔ کیونکہ اب بزمِ سُخن کے صدر برقؔ کوہاٹی اور ادبستان کے جنرل سیکرٹری فارغؔ بخاری تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بزمِ سُخن کے عہدے دار وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے لیکن بزمِ سُخن کا رویہ جوں کا توں رہا، اسی رویے کا ردعمل قمرؔ سرحدی کا ادارہ لطفِ سُخن (بزمِ ادب)، بزمِ افکار، دائرہ ادبیہ اور اب ادبستان تھا۔ دائرہ ادبیہ نے تو ادبستان سے مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا لیکن بزمِ سُخن کے انداز اُسی طرح جارحانہ رہے۔ ادبستان نے بزم سے روایتی انداز میں پنجہ آزمائی نہ کی بلکہ ادبستان کے جنرل سیکرٹری فارغؔ بخاری نے ایک عجیب کام کیا۔ بقول فارغ بخاری:

"ادبستان سے جب بزمِ سُخن کی ٹھنی تو اس تنازعہ نے طول کھینچا، ادھر نوجوان جوان تھا انہیں مذاق سوجھا فارغ بخاری نے قمر سرحدی کی معیت میں بزم سُخن کو اپنے نام رجسٹرڈ کرالیا، یہ بھنک جب بزم والوں کے کان میں پڑی تو بڑے سٹپٹائے اُنہوں نے دعویٰ دائر کر دیا۔ مقدمہ شروع ہوا رجسٹرار کی عدالت میں ادیبوں کی پیشیاں ہونے لگیں۔ قاضی قضاؔ روحی، خالص مکی اور جگر کاظمی شہادتوں میں پیش ہوئے۔ معاملہ تو تو میں میں سے ہاتھاپائی تک پہنچا یہاں تک کہ ایک دن اُسی قصہ خوانی بازار میں برقؔ کوہاٹی اور فارغؔ بخاری گھتم گتھا نظر آئے۔"[8]

1939ء میں ادبستان کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں اور فارغ ورضا کراچی چلے گئے اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد 1941ء میں واپس آئے اور انجمن ترقی اُردو کی نئے سرے سے بنیاد رکھی، اسی سال شوکت واسطی راولپنڈی سے بی۔ اے کر کے ایڈورڈز کالج میں ایم۔ اے کے لیے داخل ہوئے۔ فارغؔ کے مطابق اِسی سال یعنی 1941ء میں شوکت واسطی نے ایک ادبی تنظیم اُردو سبھا کی بنیاد رکھی جبکہ خاطر غزنوی نے اپنے مضمون میں لکھا:

"اقبال کے پیر ہندی اور مرید ہندی کے تراجم اُردو سبھا سرحد کے شعبہ دار الاشاعت نے 1944ء میں یعنی اُردو سبھا کی تشکیل کے ایک سال کے اندر شائع کیے"[9]

اس لحاظ سے اُردو سبھا کی بنیاد 1943ء میں رکھی گئی۔ اس کا صدر مقام پشاور چھاؤنی تھا۔ شوکت واسطی نہایت متحرک شخصیت کے مالک تھے اور بقول خاطر غزنوی اُنہوں نے سرحد میں معرکہ آرا مشاعروں کی طرح ڈالی، پشاور میں کل ہند مشاعرہ برپا کیا جس میں جگرؔ مُراد آبادی، علامہ تاجور نجیب آبادی، احسانؔ دانش، روشن صدیقی، عبدالحمید عدمؔ جیسی شخصیات نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ بے شمار رفاعی کام بھی کیے۔ یکایک شوکت واسطی کو بھی یہاں کی روایتی تنظیمی مخالفت کا سامنا یوں کرنا پڑا کہ دائرہ ادبیہ اور انجمن ترقی اُردو، اُردو سبھا کی حریف بن گئیں۔ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کی بنیاد رکھتے ہوئے دیگر اراکین کے ساتھ ساتھ فارغؔ بخاری کا یہ مقصد تھا کہ تمام جماعتوں کو اس میں ضم کر دیا جائے، ادبستان اور دائرہ ادبیہ تو مان گئیں لیکن بزمِ سُخن ہمیشہ کی طرح الگ ڈگر پر رہی، پر اس مرتبہ اُردو سبھا نے بھی اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات یہاں کے لوگوں خصوصاً انجمن ترقی اُردو کے اراکین اور خصوصاً فارغؔ بخاری کو ناگوار گزری اور فارغؔ اور شوکت کی اولین دوستی کے باوجود ٹھن گئی اور شوکت جو فارغؔ بخاری ہی کے کہنے پر پشاور آئے تھے دونوں کی طبیعتوں نے میل نہیں کھایا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا شوکت واسطی نے بے شمار رفاعی کام بھی کیے تو جب بنگال میں قحط پڑا تو شوکت واسطی نے ایک عظیم مشاعرے کا اہتمام کیا جس کے ذریعے قحط بنگال میں متاثرین کی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی۔ یہ مشاعرہ ایڈورڈ کالج میں منعقد ہوا تھا۔ فارغؔ مشاعرے کو تو ناکام نہ کر سکے البتہ اسی مشاعرے میں یہ رباعی لکھ کر پڑھ دی:

اغراض سے معمور ہے دھندا سارا
یکسر ہے خرافات پلندہ سارا

بنگال کے بھوکوں کو تو روٹی نہیں ملی
خدامِ ادب کھا گئے چندہ سارا

اس کے بعد شوکت واسطی نے مشاعرے میں جواب دینا چاہا تو صدرِ مجلس نے اُنہیں روک دیا، اس پر احتجاجاً اُردو سبھا کے سبھی ارکان واک آؤٹ کر گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشاعرہ درہم برہم ہو گیا منتظمین کو بڑا غصہ آیا اور وہ اُردو سبھا والوں کے پیچھے ہاکیاں لے دوڑے، مگر بیچ بچاؤ کرا دیا گیا۔ دوسری مرتبہ نذیر مرزا برلاس کے شاگرد اُس وقت چاقو لے کر شوکت واسطی پر حملہ آور ہوئے جب وہ ریس کورس کی نمائش میں مشاعرے میں پڑھ رہے تھے۔ نذیر کے ایک شعر پر شوکت واسطی نے آوازہ کس دیا تھا۔ اور پھر بقول خاطر غزنوی:

”پھر یہ وطیرہ شروع ہوا کہ اُردو سبھا جتنے مشاعرے کراتی انجمن ترقی اُردو والے (والا کہنا مناسب ہو گا) ان کو درہم برہم کرانے کی کوشش کرتے، ایجرٹن پارک میں مخالفین کے مشاعروں میں سانپ چھوڑے جاتے، پانی چھوڑ پارک کو ناقابل استعمال بنایا جاتا، بارود کے گولے داغے جاتے، شامیانوں کی رسیاں کاٹی جاتیں۔ اس کے بعد شوکت واسطی نے وہ مشہور نظم لکھی جو ریڈیو والوں اور ریڈیو مشاعرے میں پڑھنے والے مقامی شعراء کے خلاف تھی۔ جس کا عنوان تھا یہ پشاور ہے۔“[10]

وہ ریڈیو پہ شاعروں کا جمگھٹا ہے دیکھئے
پروگرام خاندان میں بٹا ہے دیکھئے
وہ جوتیاں گھسیٹتے پہنچ گئے ہیں اہل فن
نہ کار اُن کے واسطے نہ پھٹپھٹا ہے دیکھئے
فضا لرز اُٹھی ہے اور تڑپ رہا ہے ریڈیو
یہ کون آ کے میک فون پر ڈٹا ہے دیکھئے
یہ پھسپھسی سی بند شیں یہ بے تُکا سا قافیہ
کہاں پہ آ کے زور شعر کا گھٹا ہے دیکھئے
اُف ایک لفظ داد کا ملا نہ بدنصیب کو
اُگل کے اپنی نظم کون یہ ہٹا ہے دیکھئے
سوال کچھ سہی مگر جواب سب کا ایک ہے
تمام طوطیوں نے اک سبق رٹا ہے دیکھئے
نہیں قصور اہل کارواں کا کیوں بھٹک گئے
کہ میر کارواں ہی کوئی چرکٹا ہے دیکھئے

اس نظم کا جواب دوسرے ہی دن پمفلٹ کی صورت میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ایک فرضی نام سے شائع ہوا، لکھنے والے خود فارغؔ ہی تھے۔

جنہیں کہیں جگہ نہ مل سکی سبھا سے آ ملے
وہ کوئی دُم کٹا ہے کوئی پر کٹا ہے دیکھئے

وہ کوئی مال وزر کے بس بھرے نشے میں چور ہے
وہ خواجگی کی دھول سے کوئی اٹا ہے دیکھئے

دوسرا شعر فارغ بخاری کی ادبیات میں اس طرح درج ہے جبکہ خاطر غزنوی نے ایک کمرہ میں یوں لکھا ہے:

کوئی چرن جیت ہے، لبھایارام ہے کوئی
کوئی خواجگی کی دھول میں اٹا ہے دیکھئے

ان اشعار میں رائے بہادر دیوان چرن جیت جنہیں اُردو سبھا نے ”سپروے سرحد“ کا خطاب بھی دیا تھا۔ لبھایارام جوڈیشنل کمشنر تھے۔ خواجہ محمد اشرف محکمہ تعلیم کی معروف شخصیت تھے یہ سب اُردو سبھا کے مربی تھے۔ اُردو سبھا قیام پاکستان تک ادبی اشاعتی کاموں میں مصروف رہی یہاں تک کہ قیام پاکستان کے بعد اُردو سبھا کا نام تبدیل کر کے اُردو مرکز کر دیا گیا۔

پشاور میں لاہور اور کراچی کے برعکس شخصی و نجی بیٹھکوں میں ادبی محفلیں جمتیں۔ یہ روایت مسگر کی دکان سے چلی، قمر سرحدی کا مسلم ہوٹل، میر عباس میر کا قہوہ خانہ، یکہ توت میں شاہد کیانی کی رہائش گاہ، شاہ ولی قتال میں دائرہ ادبیہ کوچہ رسالدار میں جعفر علی جعفری کی دکان، عبدالواحد کا مکان، میوہ منڈی میں سیٹھی صاحب کا بالاخانہ، شاہی باغ، رلے کا باغ، وزیر باغ، محلہ خداداد کا نیا مکتبہ اور سنگ میل کا دفتر، مظہر گیلانی کی ضیغم لاج، شوکت واسطی کا کالی باڑی کا دفتر'گھنٹہ گھر کے ساتھ خادم تمباکو والے کی دُکان، پشاور یونیورسٹی میں ڈاکٹر مظہر علی خان کا بنگلہ' خاطر غزنوی کا یونیورسٹی والا بنگلہ یہ سب جگہیں ادیبوں کی نشتوں کے لیے مخصوص ہو گئیں۔ یہ سب جگہیں شعراء و ادبا، اہل قلم، پروفیسروں اور صحافیوں کا مستقل ٹھکانہ بن گئیں۔ یہیں سے علم و ادب کے سوتے پھوٹے یہیں مل کر قہقہے لگائے یہیں آپس کی رنجشیں ہوئیں، یہیں دل ماندگیاں ہوئیں یہیں راضی نامے ہوئے۔ مگر کسی بھی عمل نے علم و ادب کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا۔ قلم سے علم حاصل کرنے کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا جو آج دبستان پشاور کی خصوصیات کا احاطہ کیے ہوئے تاریخ کے پنوں پر ثبت ہو کر ادبیات سرحد کی چشمکوں کا احوال بیان کرتا دکھائی دیتا ہے۔

رقابت سے پیدا ہونے والے رشک اور حسد کے جذبات اس وقت عروج پاتے ہیں، جب کمال اپنے طرہ امتیاز کو پہنچا ہوا ہو۔ دبستان پشاور کی یہ ادبی رقابتیں اس امر کی عکاس ہیں کہ پشاور برصغیر کے ان چند خطوں میں سے ایک ہے، جہاں اُردو ادب نے نہ صرف فروغ پایا بلکہ اس خطے نے اس لشکری زبان کا عروج بھی دیکھا۔ یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہیں کے ادیب و شعراء نہ صرف پاکستان بلکہ برصغیر میں اپنے کمال تخیلات کا معجزے دکھلاتے نظر آتے ہیں اور آج بھی پشاور کی مٹی کی زرخیزی شعر و ادب میں پشاور کو ایک ممتاز حیثیت دلاتی ہے۔ ادب کے اسی معتبر شہر میں ادبی چشمکوں نے جہاں ادبی ماحول کو گرمایا وہیں رقابت کی فضا نے پشاور کے شعراء واُدبا کے فن کو بھی نکھارا اور ادب کے بڑھتے ہوئے قدموں میں ڈھلی زنجیروں کو توڑ کر ادبی چشمکوں میں بھی اپنا نام پیدا کیا۔ ان چشمکوں کے نتیجے میں پشاور میں تیزی سے اُردو ادب کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے ادب نے بھی فروغ پایا۔ انہی چشمکوں کی نعمت سے مشاعروں پر مشاعرے منعقد ہوئے جن کو کامیاب بنانے کے لیے سرحد پار سے بھی بڑے شعراء کو بلایا جاتا رہا اور اُن کی ادبی تخیل سے پشاور کے ادیبوں اور عوام کے اذہان کو منور کیا جاتا رہا۔ مقامی شعراء اور اُدبا نے ادبی فن پاروں سے رقیبوں کی منہ شگافیوں کا جواب دینے کا ہنر بھی انہی مشاعروں میں سیکھا۔ ادبی اکھاڑوں میں طرحی مصرعہ مشاعروں کے ساتھ ساتھ اپنے مدمقابل کو مات دینے کے لیے فی البدیہہ شاعری ہونے لگی جو یقیناً ادبی عروج کی نشانی کہلائی جاسکتی ہے۔ غرضیکہ کہ ذاتی چپقلش کا جواب شعراء و ادبا نے ہاتھ اور پاؤں سے دینے کے مقامی کلچر کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، تاہم ادبی حوالوں سے اپنے تخیلات کی باریک بینی سے بھی حریف کو چت کرنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی جس سے پشاور کے ادب میں یقیناً نکھار پیدا ہوا اور جو آنے والے ادب کے رسیا کے لیے یقیناً ایک درس متین کا درجہ رکھتا ہے۔

حوالہ جات

1 محمد یعقوب عامر، ڈاکٹر، **اُردو کے ادبی معرکے**،(نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، 1992ء)، ص13-

2 ایضاً، ص16-

3 فارغ بخاری، **ادبیات سرحد**، جلد سوم، (پشاور: نیا مکتبہ، 1955ء)، ص79-80-

4 محمد اقبال نجمی، سجاد مرزا، **پروفیسر شوکت واسطی فن اور شخصیت کے آئینے میں**، (گوجرانوالہ: فروغ ادب اکادمی، 1998ء)، ص49-

5 فارغ بخاری، **ادبیات سرحد**، جلد سوم، (پشاور: نیا مکتبہ، 1955ء)، ص84-

6 ایضاً، ص89-

7 ایضاً، ص95-

8 ایضاً، ص99-

9 محمد اقبال نجمی، سجاد مرزا، **پروفیسر شوکت واسطی فن اور شخصیت کے آئینے میں**، (گوجرانوالہ: فروغ ادب اکادمی، 1998ء)، ص55-

10 خاطر غزنوی، **ایک کمرہ**، (پشاور: سنڈیکیٹ آف رائٹرز رجسٹرڈ گل بہار، 2001ء)، ص97-98-